© rasailojaraid.com

"جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی"

پروفیسر محمد عثمان

صدر محمد ایوّب خان کی تصنیف "آقا نہیں دوست"[1] پر ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات میں کافی تبصرے ہو چکے ہیں اور ملک کے اندر اور ملک سے باہر بے شمار لوگوں نے اس کا خیر مقدم کیا ہے اور یقین ہے کہ وقت کے ساتھ اس کتاب کی اہمیّت اور افادیت کا احساس بڑھے گا۔ تاہم میں نے محسوس کیا ہے کہ کتاب یا خود مصنّف کی شخصیت کے کچھ پہلو ایسے ہیں جن کی طرف کم یا بالکل توجّہ نہیں دی گئی حالانکہ اس کے مناسب ذکر کے بغیر تبصرے یا تنقید کا حق میرے خیال میں ادا نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا یہ مضمون لکھا جا رہا ہے۔

۱

میں اپنی بات اسلوبِ بیان سے شروع کرتا ہوں۔ نظم ہو یا نثر غالباً پہلی چیز جو قاری کو متاثر کرتی اور اسے تصنیف کی طرف کھینچتی ہے، لکھنے والے کا اسلوب ہے۔ اسلوب محض اندازِ بیان، لفظوں کے رکھ رکھاؤ اور ترکیبوں یا تشبیہوں کے استعمال کو نہیں کہتے ہیں۔ اسلوب حقیقت میں شخصیّت کا دوسرا نام ہے۔ لکھنے کے انداز میں دراصل لکھنے والے کی شخصیت کھل کر سامنے آتی ہے۔ صدر ایوب کے بے شمار خطبوں، تقریروں اور بیانات کی طرح یہ خود نوشت سوانح بھی ایک ایسی

---

[1] کتاب کا اردو ترجمہ "جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی" بازار میں آنے سے پہلے یہ مضمون مکمل ہو چکا تھا۔ چونکہ اصل انگریزی ایڈیشن میرے پیش نظر تھا اس لئے کتاب کا حوالہ "آقا نہیں دوست" سے دیا گیا ہے۔ اقتباسات کا ترجمہ بھی میرا ہے (عثمان)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شخصیت کو ہمارے سامنے لاتی ہے جو صاف، کھری، واضح اور دوٹوک ہے۔ آپ صدر کے خیالات وافکار سے اتفاق کریں یا اختلاف۔ غالباً اس امر سے انکار نہیں کرسکتے کہ ان کا خیال اور اس کا اظہار پیچیدگیوں، بناوٹوں اور ظاہرداریوں سے خالی ہوتا ہے۔ ایک سچّے اور کھرے فوجی کی طرح ان کا ظاہر اور باطن، ان کا دل اور زبان ایک ہے۔

لیکن یہ کھراپن خشک، بے نمک یا کم استعداد نہیں۔ کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ لکھنے والے کی شخصیت کا اگر اوّلین جوہر صفائی اور بے لاگ پن ہے تو اس کی دوسری خوبی شگفتگی اور پیرایۂ ابلاغ پر ایک خاص قدرت ہے جو اظہار کو بیک وقت دلکش اور مؤثر بنانے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ کتاب میں بیسیوں مقامات پر ایسے مسائل یا مواقع کا بیان ہے جو ایک کم ذہین اور ناشگفتہ مزاج قلمکار کے ہاتھوں واقعات کی ایک بے جان رپورٹ بن کر رہ جاتا مگر صدر ایوب کی شگفتہ نگاہی اور قدرتِ اظہار نے ان کو کچھ ایسے زاویے سے دیکھا اور کچھ اس ڈھنگ سے بیان کیا ہے کہ ان کی سچائی میں ایک تازگی اور ایک دلآویزی پیدا ہوگئی ہے۔ مجھے معلوم نہیں اپنے اس خیال کی تائید یا ثبوت میں مجھے یہاں چند مثالیں پیش کرنے کی ضرورت ہے کہ نہیں کیونکہ جو لطف اور تیقّن اصل کتاب کو اس کے پورے سیاق وسباق کے ساتھ پڑھنے میں ہے، وہ بعض سطروں کے انتخاب سے، خواہ وہ کیسی ہی عمدہ کیوں نہ ہوں، حاصل نہیں ہوسکتا۔ تاہم ایسے قارئین کے لئے جنہیں اب تک یہ کتاب دیکھنے کا موقع نہ ملا ہو، دو چار اقتباسات پیش کرتا ہوں۔

مصنّف اپنے نیم کوہستانی جنم بھوم ریحانہ میں، جس کے دُور پس منظر میں ہمالہ کے ڈھلوان چیڑ کے اونچے اونچے درختوں میں گھرے دکھائی دیتے ہیں، اپنے بچپن کا ذکر کررہا ہے اور لڑکپن کی یادیں تازہ کرتا ہے۔

"میری انتہائی ابتدائی یادوں میں ایک پرندہ بھی ہے جو صبح سویرے چہچہایا کرتا تھا۔ یہ گویا سکول جانے کا اذن تھا جس کے معنی بستر سے اٹھ جانے، جلدی جلدی منہ ہاتھ دھونے اور گھوڑی کی پیٹھ پر چار کوس طے کرنے کے تھے۔ اب بھی میں جب کبھی اس پرندے کی آواز سُن لیتا ہوں تو میری طبیعت بے چین ہو جاتی ہے۔"

مصنّف کے والد رسالدار میجر میر داد خان بڑی وجاہت اور دبدبے کے انسان تھے۔ انہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسلام، مسلم قومیّت اور اسی رعایت سے سرسیّد کی تحریک سے گہرا لگاؤ تھا اور ان کی زبردست خواہش تھی کہ ان کا بیٹا علی گڑھ میں تعلیم پائے۔ چنانچہ جب یونیورسٹی میں داخلے کا مرحلہ آیا تو انھوں نے اپنے ہونہار بیٹے کو ایک نوکر کے ساتھ علی گڑھ روانہ کیا۔ وہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ یونیورسٹی کھلنے میں ابھی ایک ماہ باقی ہے اور والد نے وفورِ شوق میں انہیں کافی دن پہلے وہاں بھجوا دیا تھا۔ ہاسٹل بند ہونے کے باعث کھانے پینے اور رہائش کی دقّتوں کے پیش نظر نوکر نے مشورہ دیا کہ یونیورسٹی کھلنے تک انہیں واپس چلے جانا چاہیئے۔ لیکن نوجوان ایوّب خان کو یہ مشفقانہ مشورہ قبول کرنے میں تامل تھا۔ وجہ خود ان کی زبانی سنیئے :

"میں واپس جانا پسند کرتا لیکن اس بزرگ کا سامنا کرنے اور اسے اس بات کا قائل کرنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی کہ میں علی گڑھ سے بھاگ نہیں آیا۔"

اکتوبر ۱۹۵۴ء کا ذکر ہے۔ غلام محمدؔ گورنر جنرل تھے اور محمد علی بوگرہ وزیر اعظم۔ محمد علی بوگرہ کمانڈر انِ چیف جنرل محمد ایوب خان اور چند وزراء کے ساتھ امریکہ کی یاترا پر ہیں کہ اچانک گورنر جنرل کا پیغام ملتا ہے کہ فوراً واپس پہنچو۔ گورنر جنرل کا مزاج بگڑا ہوا معلوم ہوتا ہے اور وزیر اعظم اندیشہ ہائے دُور دراز میں کھو جاتے ہیں اور پریشانی کے عالم میں کمانڈر انچیف (مصنف) سے ضمانت چاہتے ہیں کہ واپسی پر انہیں گرفتار نہیں کر لیا جائے گا۔ اس موقع کی گفتگو ملاحظہ ہو :

وہ بار بار پوچھتے : "کیا تم یہ ضمانت دے سکتے ہو کہ میری واپسی پر مجھے گرفتار نہیں کیا جائے گا؟" میں ضمانت تو نہیں دے سکتا تھا لیکن میں نے انہیں یقین دلایا کہ ایسا واقعہ غالباً پیش نہیں آسکتا۔ پھر اُس نے کہا: "فرض کرو تم بھی گرفتار کر لیئے جاؤ؟" میں نے جواب دیا "بڑا مزہ رہے گا۔ تمہیں عمدہ صحبت میسّر ہوگی"!

ان حضرات کی واپسی پر گورنر جنرل غلام محمد مصنّف کو تنہائی میں بلا کر اپنا 'منصوبہ' اُس کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ منصوبہ دو دستاویزوں پر مشتمل ہے۔ ایک میں درج ہے کہ "میں: گورنر جنرل" اس اس وجہ سے تمام اختیارات، 'جنرل محمد ایوّب خان' کے حوالے کرتا ہوں اور دوسری میں 'جنرل محمدؔ ایوب خان' کی طرف سے اس پیشکش کو منظور کیا گیا ہے۔ صدر لکھتے ہیں :

جونہی میں نے کاغذ کے ان پرزوں پر نگاہ ڈالی میرے باطن کی ہر شئے پکار اٹھی : 'نہیں !

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہرگز نہیں'۔

قومی حالات کی ابتری سے بہ شدت متاثر ہونے کے باعث ۲ رمئی ۱۹۵۸ء سے ۲۵ ستمبر ۱۹۵۸ء تک مصنّف ڈائری کی صورت میں اپنے کچھ معمولات او رتاثرات قلمبند کرتا رہا۔ اس ڈائری کے بعض حصے کتاب کے پانچویں باب میں درج ہیں۔ یکم جون کا اندراج یوں ہے :

کشمیر کے متعلق ایک کانفرنس میں جس کی صدارت وزیر اعظم نُون نے کی، شریک ہوا۔ کانفرنس میں تین سابق وزرائے اعظم اور تھے۔ اگر یہ لوگ تھوڑی دیر اور انتظار کر لیتے تو دو سابق وزرائے اعظم کا مزید اضافہ ہو سکتا تھا۔

اور آخری ٹکڑا جو کسی توضیح کا محتاج نہیں :

اس وقت دنیا کے سامنے بھارت کے تین رُخ ہیں۔ ایک رُخ مغرب کی طرف ہے جس سے وہ چین کے خلاف لڑنے کا ارادہ ظاہر کر کے مغربی ہتھیاروں کی زیادہ سے زیادہ امداد حاصل کر رہا ہے دوسرا روس کی جانب ہے جہاں وہ عدم وابستگی کی پالیسی پر زور دیتا ہے اور تیسرا رُخ چین کی طرف ہے جس میں وہ غیر جانبدار سفارتوں کی مدد سے اپنا جھگڑا پُرامن طریق سے نمٹانے کی خفیہ کوششوں میں مصروف ہے۔

زیادہ مثالیں پیش کرنا یہاں ممکن نہیں۔ مجھے جو بات کہنی ہے یہ ہے کہ خارجہ پالیسی کی بحث ہو یا آئین سازی کا مسئلہ، کسی ذاتی واقعہ کا بیان ہو یا کسی فرد کے ذہن کا تجزیہ۔ مصنف اپنے خیال کو ایسی درستی، ایسی جامعیّت صفت اختصار اور ایسی شگفتہ بیانی کے ساتھ پیش کرتا ہے کہ جہاں تک فنِ اظہار کا تعلق ہے، ایک خوش ذوق قاری کی طبیعت کا کوئی تقاضا تشنہ نہیں رہ جاتا۔

(۲)

اسلوب کے بعد مصنّف کی مردم شناسی اور افراد کے اندر دیکھ سکنے کی غیر معمولی صلاحیّت کا ذکر کروں گا۔

یوں تو انسان فہمی ادب، فن، سیاست اور زندگی کے کس شعبے میں ایک بنیادی شرط نہیں، تاہم بے شمار لوگ بڑے بڑے منصبوں اور بڑی بڑی ناموریوں کے باوجود اس قابل نہیں ہوتے کہ اپنے ملنے والوں اپنے دوستوں اور اپنے حریفوں کے کردار اور ذہن کو ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح پڑھ سکیں اور پھر کمال صحت کے ساتھ اسے بیان کرنے پر بھی قادر ہوں۔ ہمارے ہاں یہ صلاحیت نسبتاً اور بھی کم ہے۔ شائد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہی وجہ ہے کہ بہ حیثیتِ قوم ہم خود نوشت سوانح اور اعلیٰ درجے کے ڈرامے پیدا نہیں کر سکے۔ اس لئے کہ ڈرامے اور خود نوشت سوانح لکھنے کے لئے سب سے بڑھ کر ایک ایسی آنکھ کی ضرورت ہوتی ہے جو اپنے آس پاس کے جیتے جاگتے انسانوں کے باطن میں جھانک سکے اور ان کے ذہن کی ورکنگ (WORKING) کو ٹھیک ٹھیک دیکھ لے۔

انسان بینی اور انسان بیانی کی ہمارے ہاں جو نہایت مختصر روایات ہیں، ان میں سے ایک کا تعلق اُردو ادب سے اور دوسری کا قومی سیاست سے ہے۔ اُردو ادب میں یہ استعداد بالخصوص دو قلمکاروں کی بدولت پیدا ہوئی اور آگے بڑھی۔ میری مراد بابائے اُردو مولوی عبدالحق مرحوم اور پروفیسر رشید احمد صدیقی سے ہے۔ قومی سیاست میں اس روایت کا آغاز مولانا محمد علی جوہر[1] سے ہوتا ہے۔ لیکن اس کی اعلیٰ اور قابلِ تقلید مثال ہمیں سر آغا خان مرحوم کی خود نوشت سوانح[2] میں ملتا ہے۔ جس میں ایک دو نہیں درجنوں افراد کی شخصیّتوں کا بڑا خوب صورت، بے لاگ اور حقیقت افروز تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ سر آغا خان مرحوم نے بالخصوص جس گہری نظر، دیانت اور قابلیت سے مسٹر گاندھی اور قائدِ اعظم محمد علی جناح کی شخصیتوں کے نقش ابھارے ہیں، وہ پڑھنے اور دیکھنے کی چیز ہے۔

جہاں تک میرے علم کا تعلق ہے آغا خان کے MEMOIRS کے بعد ہماری قومی سیاست کے میدان میں 'آقا نہیں دوست' پہلی کتاب ہے جس کے مصنّف کی انسان بینی ہمیں متاثر کرتی ہے۔ صدر ایوب نے ہمعصروں کی شخصیتوں پر علیحدہ سے اور تفصیلاً اظہارِ خیال نہیں کیا۔ جیسا کہ آغا خان مرحوم[3] نے کیا ہے۔ یہ کام نہ ان کے مزاج سے مطابقت رکھتا ہے اور نہ ان ذمہ داریوں کے ساتھ جو مملکت میں وہ اس وقت (اور گزشتہ پندرہ سولہ برس سے) سنبھالے ہوئے ہیں، ممکن تھا۔

۱؎ MY LIFE : A FRAGMENT

۲؎ MEMOIRS BY HIS HIGHNESS THE AGA KHAN.

۳؎ تفصیل کے ساتھ ہمعصروں کا جائزہ لینے کا رجحان' برصغیر میں' اوّلاً گاندھی اور پھر خاصے فنی شعور کے ساتھ پنڈت نہرو کے ہاں ملتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس ضمن میں ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مختلف مواقع و مسائل کی بحث کے دوران اپنے رفیقوں، اپنے حریفوں اور دوسرے ہمعصروں کا کم سے کم لفظوں میں کچھ اس طرح تذکرہ کیا ہے کہ ان کی شخصیتوں کے بنیادی خدوخال ہمارے سامنے آجاتے ہیں اور چند لفظوں سے تیار کیا ہوا یہ نقش ایسا جامع اور مکمل دکھائی دیتا ہے کہ بہت کم کے بارے میں مزید کچھ جاننے کی آرزو دل میں باقی رہتی ہے۔

جن لوگوں کی شخصیتوں کے نقش 'آقا نہیں دوست' میں ابھرتے ہیں، ان کی فہرست خاصی طویل ہے۔ تاہم جن حضرات کے بارے میں مصنّف کا اظہارِ خیال مجھے خصوصیت سے دلچسپ اور داد طلب معلوم ہوا، وہ یہ ہیں: مرحوم قائد اعظم، مرحوم لیاقت علی خان، غلام محمد، اسکندر مرزا، چوہدری محمد علی، محمد علی بوگرہ، حسین شہید سہروردی، مولوی تمیز الدین، خواجہ ناظم الدّین، سید ابوالاعلیٰ مودودی، (سابق میجر جنرل) اکبر خان، پنڈت نہرو، (مقتول صدرِ امریکہ) کینیڈی، (امریکہ کے) جنرل بیڈلے اور مصنّف کے گھرانے کی حد تک ان کے والد مرحوم رسالدار میجر میرداد خان اور بیگم ایوب خان۔

ذیل میں چند جانی پہچانی شخصیتوں کے متعلق کتاب کی متعلقہ سطور (ترجمہ) پیش کی جاتی ہیں:

قائد اعظمؒ

مسلمانوں کے مفاد کی نگہداشت میں قائد اعظم کے حسنِ تدبّر اور ان کی کامل بے غرضی اور لگن نے منتشر افراد کے ایک ہجوم کو ایک زبردست قومی حقیقت بنا دیا۔

لیاقت علی خان

میرے دل میں وزیر اعظم لیاقت علی خان کی قدر و منزلت بڑھتی گئی۔ وہ دل کے بہت بڑے دلیر اور مضبوط انسان تھے۔ کوئی بات ان کے سکونِ قلب کو زیر و زبر نہیں کر سکتی تھی۔

غلام محمدّ

غلام محمد حالات سے ہار ماننے والا انسان نہ تھا۔ اس میں اور جو بھی کمیاں تھیں جرأت کی اس میں کمی نہ تھی۔ وہ کسی بھی شخص سے لڑنے اور کسی بھی شخص کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ رکھتا تھا۔ وہ قطعی بے خوف انسان تھا۔

اسکندر مرزا

وہ سازش کی فضا میں کام کرتا اور پھولتا پھلتا تھا۔

چوہدری محمدّ علی

چوہدری محمد علی نے ایک آئین تیار کر ہی ڈالا جسے ۲۳ر مارچ ۱۹۵۶ء میں نافذ کیا گیا۔ یہ یاس و ناامیدی کی ایک دستاویز تھی۔ وزیر اعظم (چوہدری محمد علی) کو آئین کے مصنّف کی حیثیت سے تاریخ میں باقی رہنے کی ایسی بے تابی تھی کہ وہ ہر قسم کے نقطۂ خیال سے مفاہمت پر آمادہ تھے!

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

----- (۱۹۶۲ء میں آئین نافذ ہونے پر) چوہدری محمد علی اس کے سخت ترین نکتہ چینوں میں سے تھے۔ انہیں محسوس ہوا جیسے وہ بقائے دوام سے محروم ہوگئے ہیں۔

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

کچھ قوم پرست (نیشنلسٹ) علماء نے ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ باقی (ہمارا) ہاتھ بٹانے کے لئے جھٹ پاکستان پہنچ گئے۔ اگر وہ مسلمانوں کو پاکستان سے بچانے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے تو اب انہیں پاکستان کو مسلمانوں سے بچانے کی فکر ضرور کرنا چاہیئے تھی۔ ہجرت کر کے آنے والوں میں ایک مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، امیر جماعت اسلامی بھی تھے جنہوں نے پاکستان کی شدید مخالفت کی تھی ----- ان واجب الاحترام بزرگ نے پاکستان پہنچ کر جو کچھ دیکھا، اس سے ان کی دہشت زدگی کی کچھ انتہا نہ رہی۔ ملک نامسلم تھا۔ حکومت نامسلم تھی۔ لوگ نامسلم تھے۔ کوئی سچا مسلمان بھلا کسی ایسی حکومت کی وفاداری کا کیسے دم بھر سکتا تھا! سو انھوں نے لوگوں کو ان کی محرومیوں، کوتاہیوں اور ناز یبا کاریوں کا احساس دلانے کا بیڑا اٹھایا!

کینیڈی

صدر کینیڈی نے مجھ سے اتفاق کیا کہ کشمیر کے مسئلے کا حل بے حد ضروری ہے۔ لیکن ان کا خیال تھا کہ اس معاملے میں کوہ براہ راست اور مؤثر اقدام ان کے بس میں نہیں۔ مجھے وہ بے حد مصروف اور تنہا انسان دکھائی دیتے ----- میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ حالات کا ان پر شدید دباؤ تھا اور وہ کسی سے اپنے دل کی بات نہیں کہہ سکتے تھے۔

بیگم ایوّب خان

مشکل کے وقت اس نے ہمیشہ بڑی جراءت مندی اور تحمل کا ثبوت دیا ہے اور اس بات کا خیال رکھا ہے کہ کوئی امر میرے لئے وجۂ پریشانی نہ ہو۔ میرا احساس ہے کہ ایک ایسی دانا اور دُور اندیش رفیقۂ حیات کے بغیر میں زندگی میں ہرگز وہ کچھ نہ کر سکتا تھا جو میں نے کیا ہے۔

ان مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ مصنّف انسانوں کو پرکھنے اور پہچاننے کی کیسی صلاحیت سے بہرہ ور ہے۔

(۳)

کتاب کی سطر سطر سے مترشح ہوتا ہے کہ مصنّف اعتماد کے ساتھ سوچنے والا اور اپنی سوچی سمجھی ہوئی بات پر نہایت یقین اور پختگی کے ساتھ عمل کرنے والا انسان ہے۔

صدر ایوب کی سوچ کا اگر آپ تجزیہ کریں تو حقیقت پسندی (REALISM)، اعتدال (MODEATION) اور عدم ابہام (CLARITY) اس کے اہم اجزاء ملیں گے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیکن اس بارے میں مزید کچھ کہنے سے پہلے میں اس امر کو پورے زور کے ساتھ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے ہاں ادب، ثقافت، تعلیم، سیاست غرض معاشرے کے ہر اہم شعبے کے بارے میں سوچنے کا فرض ادا کرنے والے اکثر و بیشتر حضرات مثالیت (IDEALISM)، انتہا پسندی (EXTREMISM) اور جذباتیت (EMOTIONALISM) کے ساتھ سوچنے کے عادی ہیں۔ اس بات کو میں دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے ہاں سوچنے کا عمل اپنی کوئی شعوری اور معقول (RATIONAL) نہج نہیں رکھتا۔ اس صورت حال کا ایک باعث یہ بھی ہے کہ قومی میدان میں جن شخصیتوں ــــ سرسیّد، علّامہ اقبال اور قائدِ اعظمؒ نے ہماری رہنمائی کی، ہم ان کے کارناموں اور افکار کا تو تھوڑا بہت ذکر کر لیتے ہیں لیکن ان کے کارنامے اور ان کے افکار جن اصولوں اور ضابطوں کی بدولت ظہور میں آئے اور فکر و تنظیم کی جو تکنیک انھوں نے برسوں کی جانکاہی کے بعد اپنے لئے اختیار کی، ہم اس کا تجزیہ نہیں کر پاتے اور میرے نزدیک یہی سبب ہے کہ ہم فکر کی اُس عظیم روایت کو آگے بڑھانے میں ناکام رہے ہیں جو اِن تین عظیم رہنماؤں نے ہمیں بخشی ہے۔

سچ پوچھیئے تو "آقا نہیں، دوست" کا مصنّف اپنی سوچ کے انداز اور اپنے عمل کے اسلوب میں ہمارے ماضیِ قریب کے ان تین عظیم رہنماؤں کے بہت قریب ہے۔

آئیے! ہم اس بات کی وضاحت کے لئے ایک نہایت اہم موضوع "اسلام" کو لیتے ہیں۔ دین کی طرف سرسیّد، اقبال اور قائدِ اعظم کا جو رویّہ تھا، اسے مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

① اسلام کی سچائی اور حقانیت پر غیر متزلزل یقین۔

② اسلام کے اصولوں کو قوم کی زندگی میں جاری و ساری کرنے کے نصب العین سے شیفتگی۔

③ اسلام کی روح اور اس کے مبادی کو نئے حالات میں پھر سے سمجھنے سمجھانے کی ضرورت کا شدید احساس۔

④ دین کے نام پر فرسودہ اور زندگی کی راہ میں حائل رسوم و تصوّرات کی نشاندہی اور استیصال۔

⑤ غیر مسلم دنیا کی طرف سوجھ بوجھ اور صحت مندلین دین کے دروازے کھلے رکھنا۔ اس کی برائیوں سے بچنا اور اس کی اچھائیوں کو بہ نظرِ استحسان دیکھنا اور ان سے استفادہ کرنے میں مضائقہ نہ سمجھنا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میرے اس بیان کی تصدیق کے لئے آپ سرسید کے مقالات اور تفسیر قرآن، علامہ اقبال کے سیاسی خطبے اور ان کی تشکیل الٰہیاتِ جدید، اور قائد اعظم کی تقریریں اور بیانات (جو کتابی صورت میں اب دستیاب ہیں) ایک نظر دیکھئے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ آخری تجزیے میں ان تینوں رہنماؤں کا دین کے بارے میں ٹھیک ٹھیک یہی نقطۂ نظر تھا۔ اور یہی نقطۂ نظر ان کی تمام جدوجہد اور تگ و دو کے پیچھے ان کے لئے قوت اور کامیابی کا سرچشمہ رہا ہے۔ یہاں اتنی سی وضاحت شائد ضروری ہے کہ قائد اعظمؒ دینی امور میں تفصیلاً وہ عبور نہ رکھتے تھے جو عالم دین ہونے کے باعث سرسیدؒ اور مفکرِ اسلام ہونے کے باعث علامہ اقبالؒ کو حاصل تھی لیکن عملاً قائد اعظم کا رول اور فہم سرسیدؒ اور علامہ اقبال کے ہم پلّہ اور متوازی تھا۔

میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ صدر ایوب کا فہم (UNDERSADING) اور اندازِ نظر دین کے بارے میں اپنے ان عظیم پیشروؤں سے کچھ بھی مختلف نہیں ہے۔

اس کا ثبوت وہ دلچسپ اور خیال افروز بحث ہے جو کتاب کے صفحہ ۱۹۵ اور ۲۰۴ کے درمیان پھیلی ہوئی ہے اور جسے میں کتاب کا ایک نہایت اہم اور توجہ طلب حصہ خیال کرتا ہوں۔ ان صفحات میں مصنف نے اسلامی نظریۂ حیات، اسلام کے مطابق ترتیبِ آئین اور علماء کا کردار جیسے بنیادی سوالات پر جن افکار کا اظہار کیا ہے وہ اس قابل ہیں کہ اسلام کے مستقبل اور پاکستان کی تعمیر میں دلچسپی رکھنے والا ہر فرد اسے غور سے پڑھے اور اس میں بیان کی جانے والی صداقتوں کو جہاں تک ممکن ہو اپنے دل میں جگہ دے۔

یہاں میں دو باتوں کا مختصراً ذکر کروں گا۔ صدر ایوب نے ایک سوال یہ اٹھایا ہے کہ اگر ترتیب آئین اور قانون سازی کا کام اسلام کے مطابق انجام دینا ہو تو یہ فیصلہ کرنا کس کا حق ہوگا کہ کوئی خاص قانون، دفعہ یا ضابطہ قرآن اور سنت کے مطابق ہے یا نہیں ہے۔

واضح دلائل کے ساتھ اس کا جواب مصنف نے یہ دیا ہے کہ یہ حق کسی مخصوص گروہ یا طبقہ کا نہیں ہو سکتا، خواہ وہ طبقہ علماء ہی کا کیوں نہ ہو۔ یہ حق ناقابل انتقال طور پر صرف (مسلمان) عوام کا ہے جسے وہ اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعے استعمال کر سکتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے شہرۂ آفاق خطبوں میں اس سوال کا یہی جواب قریب قریب اسی طرز استدلال کے ساتھ دیا ہے[1]

---

[1] RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM BY SIR MOHAMMAD IQBAL, LAHORE, 1930, PAGE: 210-21

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک اور سوال یہ ہے کہ اسلام کی خاطر اور اسلام کے نام پر پاکستان حاصل کرنے کے بعد ہم اس امر میں کیوں ناکام ہو گئے کہ اپنی زندگیوں کو بھی اسلام کے اصولوں پر چلا سکتے؟ مصنف کے پاس اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ ہم اسلام کے مفہوم اور نظریۂ حیات کو عام فہم زبان میں متعین کرنے کے قابل نہیں ہوئے پہلی نظر میں ممکن ہے یہ جواب کافی نظر نہ آئے اور اس کے اور اسباب تحقیق کرنے کی کرید ہم میں پیدا ہو مثلاً مغربی تہذیب کے اثرات، نئے تعلیم یافتہ طبقے کی اسلام سے دوری یا مغائرت، معاشرے کے اخلاقی نظام کا خلل آپ اس قسم کے اسباب کی نشاندہی کرتے جائیے لیکن آخر کار آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ خود یہ تمام اسباب بھی زیادہ تر ہماری اس ناکامی کی پیداوار ہیں کہ ہم اسلام کے مفہوم کو آج کے مسلمان کے لئے سیدھے سادے لفظوں میں متعین اور بیان نہیں کر سکے ہیں۔

انہی صفحات میں صدر ایوب نے جدید تعلیم یافتہ ذہن اور راسخ العقیدہ علماء کے ذہن کے باہمی اشتراک اور آویزش کا قدرے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ بلاشبہ یہ آویزش پاکستان اور عالم اسلام کی موجودہ ذہنی فضا کا ایک بڑا المیہ ہے اور اگرچہ اس تصادم کے پیچھے ایک لمبی تاریخ ہے اور اس کی جڑیں گزشتہ دو سو سال کے حالات میں خاصی گہری گڑی ہیں، تاہم جیسے خود صدر ایوب نے بین السطور اشارہ کیا ہے اس آویزش کو دُور کیا جا سکتا ہے۔ کم از کم اس کی شدت میں کمی ضرور واقع ہو سکتی ہے بشرطیکہ علماء کا طبقہ تشدد اور سوءِ ظن سے کام لینے کی اپنی حکمتِ عملی پر نظرِ ثانی کے لئے آمادہ ہو جائے۔

(۴)

اوپر میں نے صدر ایوب کے اندازِ فکر کی تین خصوصیات کا ذکر کیا تھا۔ یوں تو یہ خصوصیات ان کے فکر و عمل کے ہر گوشے میں دیکھی جا سکتی ہیں لیکن زرعی اصلاحات، سندھ طاس کے سمجھوتے اور پاکستان کی خارجہ پالیسی کی تشکیل میں یہ خصوصیات خاص طور سے نمایاں ہیں اور شاید ان لوگوں کو بھی دکھائی دے سکتی ہیں جن کی بینائی نارمل سے کچھ کم ہو۔

میں جانتا ہوں ملک کا ایک طاقتور طبقہ جہاں زرعی اصلاحات سے ناخوش تھا وہاں ایک اور طبقہ اس سے غیر مطمئن بھی تھا۔ دوسرے لفظوں میں کچھ لوگ اس قسم کے ہر اقدام کے مخالف تھے اور کچھ لوگ اس راہ میں تیزی سے آگے بڑھنے کے آرزومند۔ یہ موقع نہیں کہ میں ان طبقوں کے محاسن و معائب کا جائزہ لوں۔ میں یہاں فقط یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جہاں تک صدر ایوب کا تعلق ہے، اگر دیانتداری سے دیکھا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جائے تو ان کی جاری کردہ اصلاحات ہمارے حالات اور تقاضوں کے درمیان حقیقت پسندی، اعتدال اور صاف نظری کی ایک عمدہ مثال ہے اور صحیح سمت میں پہلا جرأت مندانہ قدم۔ آئندہ چل کر ان اصلاحات کی سمت میں مزید قدم اٹھائے جائیں گے لیکن اس سے ان اصلاحات کی تاریخی اہمیت اور قدر و قیمت میں کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیئے اور نہ ان دلائل کے وزن میں جن کو مصنف نے کتاب کے صفحہ ۸۸ سے ۹۳ تک اس مسئلے کی بحث میں پیش کیا ہے۔ اس راہ میں آگے بڑھنے کی ہر کوشش سے پہلے ہمیں ان دلائل کا سامنا کرنا ہوگا۔

خارجہ پالیسی کی تشکیل اور اس کا بیان یکدم ایک شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے پیچھے جو حکمت، جو حقیقت پسندی، جو حدود شناسی اور جو حزم و احتیاط کارفرما ہے، وہ صدر ایوب کے تدبّر اور بصیرت کا ایک ناقابلِ انکار ثبوت ہے۔ آپ ستّر صفحوں پر پھیلی ہوئی اس دلچسپ اور سحر آفریں بحث کا کوئی حصّہ اٹھا کر دیکھیئے آپ کو اندازہ ہوگا کہ صدر ایوب ٹھوس حقائق سے سروکار رکھتے ہیں، ان کے مقاصد قطعی واضح اور روشن ہیں اور ان کا طریق کار اعتماد اور اعتدال کے اعلیٰ انسانی اوصاف کا حامل ہے۔ وہ ملکوں کے باہمی معاملات کی عمارت فریب، استحصال اور ظلم کی بجائے انصاف، مساوات اور دیانت کی بنیادوں پر اٹھانے کی ایک نہایت اعلیٰ مثال قائم کر رہے ہیں۔ ایک چھوٹے ملک کے لئے (جیسا کہ پاکستان ہے) آج کی الجھی ہوئی اور دست و گریبان دنیا میں ڈپلومیسی کے نازک میدان میں ان قدروں کے ساتھ قدم رکھنا اور کامیابی حاصل کرنا صرف ہمارے لئے ہی نہیں ساری ترقی پذیر دنیا اور پورے عالمِ انسانی کے لئے فخر کی بات ہے۔

اس حصّہ مضمون کو ختم کرنے سے پہلے میں ایک اور امر کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ خارجہ پالیسی کے دو ابواب میں صدر ایوب نے جو باتیں بھارت، امریکہ، چین اور روس کی نسبت سے کہی ہیں، وہ تو اہم ہیں ہی اور غالباً ہر قاری کی نظر ان پر پڑے گی اور وہ جس توجہ کی مستحق ہیں، وہ توجہ انہیں ضرور ملے گی لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ مصنف نے پاکستان کے حوالے سے اور اس کے بغیر جو باتیں افغانستان، عرب ممالک اور افریشیا (تیسری دنیا) کے متعلق کہی ہیں، وہ بھی اتنی ہی اہم اور غور طلب ہیں۔ میرے نزدیک یہ دونوں مباحث آج کے سیاسی فکر بالخصوص سیاسی مراسم کے فکر (DIPLOMATIC THOUGHT) میں برابر کے قابل قدر اضافے (WORTHY CONTRIBUTIONS) ہیں۔

(۵)

میری دانست میں ہمارے جدید سیاسی فکر کی تاریخ کا آغاز سر سیّد کی بالغ نظر تحریر "اسبابِ بغاوت ہند"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے ہوتا ہے۔ یہ ۱۸۵۸ء کی بات ہے۔ ۱۸۸۷ء اور ۱۸۵۸ء میں ہمارے اس عظیم رہنما نے اپنے دو بے مثال اور نتائج کے اعتبار سے نہایت دُور رس لیکچروں کا اس میں اضافہ کیا جن کا لُبِّ لباب یہ تھا کہ مسلمانوں کو ہندو کانگریس میں شرکت سے باز رہنا چاہیئے کیونکہ انگریزوں کے پارلیمانی جمہوری نظام کو اگر ہندوستان میں رائج کر دیا گیا (جو کانگریس کا صاف طور سے مقصود نگاہ نظر آرہا تھا) تو اس سے مسلمان سخت خسارے میں رہیں گے اور ان کا علیحدہ قومی وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ قائم کی گئی اور ڈھاکے میں جو خطبۂ صدارت اس موقع پر نواب وقار الملک نے پڑھا، وہ ہمارے سیاسی سفر کی اگلی منزل کی نشاندہی کرتا ہے۔ صدر جلسہ نے اور باتوں کے علاوہ صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا تھا: "مسلمان ہندوستان میں اپنی دوسری ہمسایہ قوموں سے ایک خمس کے قریب ہیں اور اس لئے یہ ایک بہت صاف مضمون ہے کہ اگر خدانخواستہ کسی وقت برٹش حکومت ہندوستان میں قائم نہ رہے تو اس وقت وہی قوم ملک پر حکمران ہوگی جو تعداد میں ہم سے چار حصہ زیادہ ہے۔ اور اب صاحبو! ہر ایک شخص کو چاہیئے کہ اپنے دل میں اس بات پر غور کرے کہ اس وقت ہماری حالت کیا ہو جاوے گی۔ اس وقت ہماری حالت یہ ہوگی کہ ہماری جان، ہمارا مال، ہماری آبرو اور ہمارا مذہب خطرہ میں ہوگا ...... وائے اس وقت پر جبکہ ہم کو اُن لوگوں کا محکوم ہو کر رہنا پڑے جو اورنگ زیب کا بدلا صدہا برس بعد آج ہم سے لینا چاہتے ہوں۔" ۱۹۱۰ء میں علامہ اقبال نے علی گڑھ کالج کے اسٹریچی ہال میں جو تقریر "ملّتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر" کے عنوان سے کی، اس راہ میں ایک اور سنگِ میل ثابت ہوئی۔ اس میں علامہ اقبال نے قومیت کے مغربی تصوّر کے مقابلے میں اسلامی قومیت کی توضیح و تعریف کر کے گویا سرسیّد کے دو قومی نظریے کے لئے جو ایک سیدھی سادی معاشرتی حقیقت تھی، جدید علمی، سیاسی اور فلسفیانہ بنیادیں مہیا کیں۔ علامہ اقبال کے ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۲ء کے صدارتی خطبے ہمارے سیاسی فکر کے ارتقاء کی اگلی کڑیاں ہیں جن میں سے ایک میں انھوں نے "تقسیم ہند" کا تخیل پیش کیا تھا اور دوسرے میں اسلامی قومیت اور اسلام کے سیاسی موقف کی مزید وضاحت تھی۔ اس کے بعد کی تاریخ ہمارے آنکھوں دیکھے واقعات ہیں جس میں قائدِ اعظم کی تقریریں، بیانات، خطوط اور خطبے ہمارا وقیع ترین سرمایۂ فکر ہیں۔

سرسیّد کے ۱۸۵۸ء کے رسالے اور ۱۸۸۷ء کے لیکچر سے لے کر قائدِ اعظم کے ۱۹۴۷ء کے خطبۂ صدارت تک جو چیز ہمارے سیاسی فکر میں سب سے نمایاں ہے وہ ہے مسلم قومیت کا شعور جو ہمیں ہمارے عقائد، تصوّرات اور نظریۂ حیات کی بنا پر ہمیں ہندوؤں (اور دنیا بھر کی دوسری جغرافیائی قومیتوں سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الگ اور منفرد قوم کا درجہ دیتی ہے۔

سرسیّد سے لے کر قائدِ اعظم تک ہماری نوّے سال کی سیاسی جدوجہد کا محور دراصل یہی شعور تھا۔ اس شعور نے اوّل سیاسی بیداری، پھر سیاسی تنظیم اور اس کے بعد سیاسی جدوجہد اور جنگ آزادی کی صورت اختیار کی۔ ان تمام مرحلوں میں اسلام اور مسلم قومیّت ہمارے یقین، ہمارے اتحاد اور ہماری قوت کا سرچشمہ رہی گزشتہ بیس برس میں کہ ہماری آزاد مملکت کی عمر ہے، بے شمار عوامل اور عناصر نے زمانۂ ماسبق کی طرح مسلم قومیت کے شعور کو دھندلانے اور اس کے دھارے کو روکنے کی کوششیں کی ہیں۔ اس 'جہاد' میں سیاسی 'رہنما' بھی شامل ہیں اور 'دانشور' بھی۔ 'غیر' بھی اور 'اپنے' بھی۔ بعضوں نے حضرت قائدِ اعظم کی ایک تقریر کی آڑ لی۔ اور بعضوں نے 'جدید سیاسی فکر' کو اپنے استدلال کی بنیاد بنایا۔ کچھ کو 'تاریخ' کی محبّت بے چین کیے ہوئے ہے۔ اور کچھ کو 'جغرافیے' کی الفت۔ اس عرصے میں متعدد مضامین نظم و نثر ایسے شائع ہوئے ہیں جن میں یہ خیال (خاصی دردمندی کے ساتھ) پیش کیا گیا ہے کہ اب جبکہ آزادی حاصل ہو گئی اور ملک بن گیا، ہمیں اپنے تصوّر قومیّت پر نظرِ ثانی کر کے اسے زیادہ معقول، 'ذوقِ زمانہ' کے مطابق اور دنیا کے لئے زیادہ 'قابلِ قبول' بنا لینا چاہیئے۔

صدر ایوّب کے اندازِ فکر اور 'آقا نہیں دوست' کی ایک بڑی اہمیت میری نظر میں یہ ہے کہ اس سے مسلم قومیت کے شعور کی لَو بڑھتی اور پھیلتی اور تیز ہوتی ہے۔

دراصل صدر ایوّب نرے سپاہی، نرے منتظم یا نرے لیڈر نہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب کے علاوہ ان کی متعدد تقریروں اور خطبوں سے یہ بات قطعی واضح ہے کہ ان کا سیاسی فہم اور ان کی انتظامی بصیرت ایک گہرے تاریخی شعور کی حامل ہے۔ ایسا نہیں کہ رفتارِ زمانہ پر کڑی نظر رکھنے والا یہ شخص قومیت کے جدید تصوّرات اور وقت کے سیاسی 'تقاضوں' سے ناواقف ہے۔ مسلم قومیّت کے بارے میں اس کا غیر مفاہمانہ اور دلیرانہ موقف اس کے اس یقین کی پیداوار ہے کہ جس طرح ماضی اور ماضی قریب میں یہ شعور ہماری قوت اور اتحاد کا باعث تھا، مستقبل میں بھی یہی شعور ہماری قوت اور اتحاد کی ضمانت ہو سکتا ہے اور یہ کہ ہمارے نظریۂ حیات میں اتنی صداقت، اتنی توانائی اور اتنی افادیت موجود ہے کہ وہ دنیا کے کسی بھی نظریۂ حیات کی صداقت، توانائی اور افادیت کا حریف ہو سکے۔ صدر ایوب میں اسلام اور اسلامی قومیّت کے لئے بالکل کوئی احساسِ کمتری نہیں ہے۔

'مضبوط مرکز' کا فلسفہ بھی تاریخی شعور کی اس پختگی سے پیدا ہوا ہے۔ دوسرے ملکوں اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قوموں کی تاریخ بھی اس کی نفی نہیں کرے گی لیکن مسلمانوں کی تاریخ کا تو ایک ایک ورق اس امر کی زندہ شہادت ہے کہ مرکز کی مضبوطی ہماری قوت اور ترقی اور مرکز کا ضعف ہمارے تنزّل اور تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوا ہے۔ دُور جانے کی ضرورت نہیں۔ بابر سے اورنگ زیب اور اورنگ زیب کے جانشینوں سے انگریزوں کے ہاتھوں اپنی غلامی کی تاریخ پر کوئی نصابی کتاب ہی اٹھا کر دیکھ لیجئے تو یہ حقیقت آئینہ ہو جائے گی کہ مرکز کی مضبوطی میں کیا کیا برکتیں اور سعادتیں تھیں اور مرکز کی کمزوری سے کیا حشر برپا ہوئے۔

میں جب ۱۸۵۸ء سے ۱۹۵۸ء کی اپنی تاریخ اور اپنے سیاسی فکر پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے سر سیّد، اقبال، قائدِ اعظم اور محمد ایوّب خان ایک صف میں کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ جس فکر و مقصد کے بیج سر سیّد نے ۱۸۵۸ء میں بوئے تھے اور جسے چند سال بعد انھوں نے مسلمانوں کو ہندوؤں سے الگ اور خبردار رہنے سے تعبیر کیا تھا اور جسے درمیان میں اقبالؒ نے اسلامی قومیّت اور تقسیم ہند اور پھر قائدِ اعظمؒ نے تحریکِ پاکستان اور قیامِ پاکستان کی صورت عطا کی، آج وہ اپنے ٹھیک ٹھیک منطقی ربط و ارتقا میں صرف مسلم قومیّت اور مضبوط مرکز کے نصب العین ہی میں بیان کیا جا سکتا ہے [1]

لیکن اس ضمن میں میں ایک بات اور کہنی چاہتا ہوں۔ مسلم قومیّت کی تحریک میں مسلمانوں کے معاشی مفاد کو ابتدا ہی سے ملحوظ رکھا گیا تھا لیکن وہ زمانہ ایسا تھا کہ قوم کے مجموعی مفاد ہی کی بات کی جا سکتی تھی۔ قوم کے مختلف طبقوں میں امتیاز کرنا یا علیحدہ علیحدہ ہر طبقہ کے معاشی مفاد کا سوال اٹھانا مصلحت کے خلاف تھا۔ صرف علاّمہ اقبالؒ نے اپنے آخری سالوں میں اور وہ بھی قائدِ اعظمؒ کے نام پرائیویٹ خطوں میں اس امر کا احساس دلایا تھا کہ مسلم لیگ کو غریب مسلمانوں کی معاشی بدحالی کا بھی کوئی علاج سوچنا ہوگا۔ [2] اور پاکستان بن جانے کے بعد قائدِ اعظمؒ اس پوزیشن میں تھے کہ اپنی آزاد مملکت کے سوچنے اور انتظام کرنے والوں

---

[1] "بھارتی قومیت ہندوازم اور پاکستانی قومیت اسلام پر مبنی ہے۔ یہ دونوں فلسفے بنیادی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔" (آقا نہیں دوست، صفحہ ۱۲۸) — " اگر کوئی مخالف جماعت پاکستان میں مسلم قومیّت اور مضبوط مرکز کے لئے کام کرے، تو اسے میری حمایت حاصل ہوگی۔" (ایضاً صفحہ ۲۲۲)

[2] اقبال کے خطوط جناح کے نام، مطبوعہ لاہور، محمد اشرف۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرانے۔[1]

اب بھی ہم چاروں طرف جن عناصر سے گھرے ہوئے ہیں اور صنعتی اور زرعی پیداوار کے جن مراحل سے گزر رہے ہیں' ان کا تقاضا ہے کہ طبقاتی امتیاز اور سوال کو کھڑا نہ کیا جائے لیکن دولت جس رفتار سے چند ہاتھوں میں مرکوز ہو رہی ہے' اس کی روک تھام اور مفلوک الحال اکثریت کے معاشی مفاد کا خصوصی تحفظ' میرا خیال ہے اب وقت کا ایک نہایت اہم تقاضا ہے۔ اور پیشتر اس کے کہ طبقاتی امتیاز کو جائز یا ناجائز طریقوں سے استعمال کرنے والے ہماری مشکلات کو بڑھانے اور ہماری بصیرت کو دھندلانے کا باعث ہوں، دولت کی اس شدید ناہمواری کے سوال کو ہمیں خود اپنے ہاتھوں میں لینا چاہیئے اور مسلم قومیت اور مضبوط مرکز کے ساتھ معاشی انصاف کے تیسرے جزو کو غیر مبہم طور سے لپنے قومی نصب العین میں شامل کرکے اپنے فلسفے کو زیادہ جامع اور سر سیّد، اقبال اور قائد اعظم کی روحِ مقاصد سے قطعی ہم آہنگ کر لینا چاہیئے۔

صدر ایوّب نے ہمارے تیسرے پنجسالہ منصوبے کے خاکے کے لئے جو پیشِ لفظ رقم کیا ہے اس میں انھوں نے اسلامی سوشلزم کے حصول وقیام کو اپنی تمام ترقیاتی اور معاشی منصوبہ بندیوں کا مقصود قرار دیا ہے۔ اور اپنی فطری اعتدال پسندی کی بنا پر اس پیشِ لفظ میں یہ بھی لکھا ہے کہ ہم نے ذرائعِ دولت کو قومی تحویل میں لینے کا کوئی بڑا تجربہ نہیں کیا، سوشلزم کے جذباتی نعرے نہیں لگائے اور نجی شعبے میں چنداں مداخلت نہیں کی۔ دونوں طرف کی ان سرحدوں کی نشاندہی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس ملک میں اسلام کے اصولوں پر معاشی انصاف کا قیام اگر زیادہ نہیں تو کم از کم اتنا مشکل ضرور ثابت ہونے والا ہے جتنا کہ اس زمانے میں 'اسلامی آئین' کی ترتیب وتدوین کا کام۔ اب اگر چودہ پندرہ برس کی تگ ودو، کشمکش اور سوچ بچار کے بعد ہم ایک قابلِ عمل آئین تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اگر اسلامی سوشلزم کے مسئلے کو سنجیدگی کے ساتھ اپنے ہاتھ میں لیں تو آئندہ پندرہ بیس برس کی مدت میں ایک 'قابلِ عمل' حل اس کا تلاش نہ کرلیں۔ میں نام اور نعرے پر مُصرّ نہیں ہوں۔ آپ اسے 'اسلامی سوشلزم' کہیں یا اسلام کا معاشی عدل یا محض معاشی انصاف یا پھر پاکستانی نظامِ معاش، آپ جس نام سے چاہیں اسے پکاریں لیکن اس سوال کو مسلم قومیّت اور مضبوط مرکز کے بعد لیکن ان کے ساتھ آپ ضرور رکھیں۔ ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ

---

[1] قائد اعظم کی آخری سال کی بعض تقریریں' بالخصوص سٹیٹ بنک آف پاکستان کے افتتاح کے موقع کی تقریر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ابلیس اپنی چال میں کہیں کامیاب نہ ہو جائے اور ہمارے 'فاقہ کش' کے بدن میں 'روحِ محمدؐ' باقی نہ رہے۔

(۶)

اور آخر میں کتاب کی مجموعی اہمیت و افادیت کے متعلق میں کہوں گا کہ اوّل، ملک کے نوجوانوں اور مسائل میں دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ایک نہایت عمدہ دستاویز مہیا ہو گئی ہے جس سے وہ اپنے ماضیٔ قریب اور حال کے مسائل کو ایک علمی زاویے سے دیکھنے کے قابل ہوں گے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ملک کا ہر سوچنے والا ضرور اس زاویۂ نگاہ کو اپنائے، لیکن میں یہ ضروری کہوں گا اور اس واقعہ کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں کہ ایک قومی زاویۂ نگاہ غیر مبہم انداز میں ہمارے سامنے رکھ دیا گیا ہے جو سنجیدگی کے ساتھ سوچنے والوں کے لئے نقطۂ آغاز اور تحریک کا کام دے سکتا ہے۔

دوم، اس صدی کے تیسرے اور چوتھے عشرے میں اقبال کی تحریروں اور تقریروں اور تحریکِ پاکستان کے زمانے میں قائدِ اعظم کے خطبوں اور بیانوں کے بعد کے تقریباً انیس بیس برس کے عرصے میں اس کتاب کے ذریعے پہلی بار پاکستان کا موقف (بالخصوص بھارت کے مقابلے میں) پاکستان کا نقطۂ نظر اور پاکستان کے مقاصد دنیا بھر کے سامنے اس قدر زور، اعتماد اور حسنِ استدلال کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب ستمبر ۶۵ء کی جنگ کے بعد پاکستان کے لئے عزت اور عالمی ہمدردیاں جیتنے کا دوسرا بڑا ذریعہ ثابت ہو گی۔

اور سوم اس کتاب سے ایک قابل، خود اعتماد، بڑے حقیقت پسند انداز میں سوچنے والے اور بڑی اعتدال پسندی کے ساتھ عمل پیرا ہونے والے ایک عظیم پاکستانی کا قلب و ذہن منکشف ہوتا ہے۔ یہ انکشاف قومی اور سیاسی اہمیت بھی رکھتا ہے اور علمی و ادبی قدر و قیمت بھی۔

© rasailojaraid.com